سینتیسواں سفر ۔ واپس پاکستان

شعر و شاعری اور مشاعرے تو یہاں امریکہ میں بھی چلتے ہیں اور اب تو بہت بڑھ گئے ہیں۔ ۱۹۹۶ء کا سال ادبی سال رہا۔ لوگ شوق سے آتے ہیں، اور آندھی طوفان کی بھی پرواہ نہیں کرتے۔ ایسا ہی ایک مشاعرہ تھا ۱۶/نومبر کو جو نوشی گیلانی اور مضطر مجاز نے منعقد کروایا تھا۔ اِس میں مقامی شعرا کے علاوہ انڈیا سے منظر بھوپالی بھی آئے ہوئے تھے۔ اِس دن اتنی شدید بارش ہو رہی تھی کہ ہماری ڈھائی ٹن کی کار فری وے پر لگتا تھا کہ اب اُڑی اور تب اُڑی، اور اسی طرح ڈگمگاتی ہوئی منزل پر پہنچی۔ ہم تو رات ۱۲/ بجے اُٹھ آئے تھے، لیکن یہ مشاعرہ رات ۲/ بجے تک چلا۔

جاوید سیّد کے کتابی مجموعہ کلام بنام ''دیارِ مغرب سے'' کی تقریبِ رونمائی میں بھی کچھ ایسا ہی ہوا۔ سیّد صاحب نے اِس محفل کے لئے بے ایریا میں ایک گشتی کشتی یا فیری کرایہ پر لی اور دعوتِ شرکت دی۔ سب شائقین نے ۵۵/ ڈالر کے ٹکٹ لئے جس میں عشائیہ کی قیمت بھی شامل تھی۔ ۲۱/ دسمبر ۱۹۹۶ء کو شام ۷/ بجے سان فرانسسکو کے ایمبارکڈیرو (Embarcadero) فیری ٹرمینل پر پہنچنا تھا اور اس دن بارش اِس زور و شور سے آندھی طوفان کے ساتھ برس رہی تھی کہ امید نہیں تھی کہ لوگ پہنچ جائیں گے۔ پھر بھی دیکھا کہ شائقین اسی بارش اور طوفان میں وقتِ مقررہ پر پہنچ گئے جبکہ ہم تو کچھ دوسری وجوہات کی بناء وہاں شام ۵/ بجے ہی پہنچ گئے تھے۔ بہت بڑی محفل تھی اور دوسو سے زیادہ شرکاء تھے، گو کہ مہمانِ خصوصی ملیحہ لودھی کے سلسلے میں کچھ تشویش تھی کہ وہ نہیں پہنچیں۔ ملیحہ لودھی اُن دنوں امریکہ میں پاکستان کی سفیر تھیں۔ بالآخر اُن کے بغیر فیری چلی اور

تقریب شروع ہوئی۔ بادل بھی چھٹ گئے اور چاند نے بھی ذرا سی جھلک بادلوں کے آنچل سے دکھائی۔ ویسے بھی شہر کی روشنیوں سے چاروں طرف ستارے سے چمک رہے تھے۔ پانی پر جب عکس پڑتا تو لگتا جیسے زمین پر بھی تاروں کی بارات آئی ہوئی ہے۔شعروشاعری چلی۔کمپیئرنگ نوشی گیلانی کر رہی تھیں۔ پروگرام کی دلچسپی کے لئے ایک مصرعِ طرح میں کچھ شاعروں سے کلام سنانے کو کہا گیا۔حضرات کے لئے جو مصرع دیا گیا جو کچھ ایسا تھا.......

؎ سر پر شوہر کے یہاں عورت کھلی تلوار ہے

اور خواتین کے لئے تھا:

؎ مرد درِ پردہ ہر اک فتنہ کا آلہ کار ہے

اِس کے جواب میں ہم نے پڑھا:

آج بھی مشکل میں عورت ہے، وہی رفتار ہے
اب بھی ہیں وہ سلسلے، اب بھی وہی گفتار ہے

محفل کے اس حصّے کے اختتام پر ہم اور دوسرے مہمان فیری میں ہلتے ڈولتے اوپر کی منزل پر گئے اور کھانے کی پلیٹ مضبوطی سے پکڑ کر کھانا نیچے لائے۔کھانا ختم ہوا اور پروگرام دوبارہ جاری ہوا۔محفل کے دوسرے حصّے میں شعرا اپنا کلام پڑھ رہے تھے۔ہمیں بھی دعوت دی گئی تو ہم گئے اور خود کو قدموں پر سنبھالتے ہوئے پڑھا، کہ فیری ہلکے ہلکے ڈول رہی تھی اور مائک بھی اِدھر اُدھر ہو رہا تھا......

لبِ ساحل جو جشنِ دوستاں ہے
نیا یہ رنگِ محفل اور سماں ہے

محفل ختم ہونے سے پہلے جاوید سیّد نے مذاقاً کہا کہ ''یہ کشتی اُس وقت تک ساحل سے نہیں لگے گی جب تک آپ سب حضرات ایک ایک کتاب نہیں خریدیں گے''۔کتاب بکی، لوگ باگ بھی محفل سے محظوظ ہوئے۔ یہ محفل بھی رات ایک بجے تک جاری رہی۔

امریکہ میں آنے کے بعد ایک اہم کام تھا امریکی شہریت اختیار کرنا۔ دل تو جہاں کا ہوتا ہے سو ہوتا

ہے، لیکن کچھ دنیاوی تقاضے ایسے اہم ہوتے ہیں جن کی وجہ سے امریکی پاسپورٹ اہم تھا۔ پھر سچی بات ہے کہ امریکی حکومت امریکیوں کے لئے اچھی رہتی ہے۔ پچھلی مرتبہ جب ہم حج پر گئے تھے تو پاکستانی پاسپورٹ کے باعث کافی تکلیف رہی تھی۔ امریکی پاسپورٹ سے یہ مشکلات نہ ہوتیں۔ اسی طرح لندن اور کینیڈا وغیرہ جانے میں بھی آسانی رہتی تھی۔ یہی سوچ کر ہم نے امریکی شہریت کا فارم بھر کے بھیج دیا اور کچھ دنوں بعد ہمارے انٹرویو کی تاریخ بھی آ گئی۔

اب صبح شام امریکی تاریخ، یہاں کے صدر، گورنر، اور سینیٹروں کے نام یاد کئے۔ امریکی اور کیلیفورنیا کا نقشہ ذہن نشین کیا۔ امریکہ کے آئین کو بھی اچھی طرح سمجھا، اور پھر سب سے بڑی چیز یہ کہ انگریزی بولنا سیکھنا شروع کیا۔ انگریزی سمجھنا تو اتنا مشکل نہ تھا کیونکہ یہاں کے ٹیلی وژن پر سارا دن انگریزی میں پروگرام دیکھ دیکھ کر ہم ان کی انگریزی سمجھنے لگے تھے۔ ہمارا انٹرویو امریکی امیگریشن سروس کے اوکلینڈ کے دفتر میں ہوا۔ انٹرویو لینے والی ایک خاتون ہی تھیں۔ انہوں نے ایسے ہی تکلّفاً ایک دو سوال کئے، اور پھر نکلتے وقت ہم نے ان کو گلے لگا کر انہیں الوداع بھی کہا۔ نتیجہ یہ رہا کہ ہمیں شہریت ملنے کی تاریخ مل گئی جس کی تقریب ۲۲ / جولائی ۱۹۹۷ء کو سان فرانسسکو میں ہونا تھی۔ یہ محفل ایک بہت بڑے آڈیٹوریم میں ہوئی جس میں تقریباً ایک ہزار اشخاص جمع تھے۔ یہاں پہنچے تو سب سے پہلے ہمارا گرین کارڈ لے لیا گیا اور ہمیں ہمارا شہریت نامہ دیا گیا۔ اب ہم ہال میں اندر گئے تو وہاں سب لوگ خاموشی سے بیٹھے تھے۔ ایک جج صاحب آئے اور انہوں نے سب اچھی بات یہ کہی ''...... میں اور دوسرے سارے امریکی یہاں اسی طرح آئے ہیں جس طرح آپ آئے ہیں۔ ہم بھی ایسے ہی مہاجر ہیں۔ اب آپ لوگ جب یہاں کی شہریت لیں گے تو ہم سب اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ آپ اپنے پرانے ملک کو بالکل نہیں بھول سکتے، اور نہ ہی ہم یہ توقع رکھتے ہیں۔ لیکن اب آپ یہ قسم کھا رہے ہیں کہ آپ امریکہ کو اپنا ملک سمجھیں گے اور امریکہ کے مفاد کو اپنا مفاد سمجھیں گے ......''۔ کتنی حقیقت پسندانہ قسم کھائی گئی تھی جس میں نہ زور تھا نہ زبردستی۔ ایک ماہ بعد ہمیں امریکہ کا پاسپورٹ مل گیا۔ اب دنیا میں اکثر جگہ جانے کے لئے ویزا کی ضرورت نہیں رہی، لیکن افسوس کہ اب پاکستان جانے کے لئے ہمیں ویزا لینا پڑتا تھا، اسی طرح جیسے ہندوستان چھوڑنے کے بعد وہاں کا ویزا لینا پڑتا تھا۔

جہاں ہم شاعری اور ادبی محفلوں میں اپنے ماضی کو حال میں لا رہے تھے، ہماری نئی امریکی نسل جو

یہاں کے ماحول میں پل رہی تھی، اپنا حال اور اپنے مستقبل کے ماضی کو امریکی معاشرے میں تیار کر رہی تھی۔ ان بچوں کو اسلامی تعلیم بھی ملتی تھی اور امریکی بھی۔ یہ دونوں معاشروں سے اثر انداز ہو رہے تھے۔ انہی امریکی اثرات میں ایک تھا ہالووین (Halloween) جو یہاں بچوں میں بہت مقبول ہے۔ اس دن بچے طرح طرح کے لباس پہن کر رات کو باہر نکل آتے ہیں اور گھر گھر جا کر چاکلیٹ اور ٹافیاں جمع کرتے ہیں۔ ہم نے بھی اپنے گھر کے باہر کی روشنیاں جلا کر رکھی تھیں۔ گھر کے باہر ایک بہت بڑا کدّو رکھا تھا جس میں کٹاؤ کئے گئے تھے دانتوں اور آنکھوں کے۔ اندر ایک بیٹری سے روشنی کی ہوئی تھی۔ شام سے ہی بچے آنے لگے گو کہ ابھی اندھیرا نہیں ہوا تھا۔ ہم نے بہت سی ٹافیاں خرید کر رکھی تھیں۔ ہر دو منٹ بعد دروازے کی گھنٹی بجتی اور ہم باہر نکلتے۔ بچے نعرہ مارتے ''ٹرک اور ٹریٹ'' (Trick or Treat)۔ ہم انہیں ٹافیاں دے دیتے۔ کچھ تخریبی بچوں کو اگر آپ ٹافیاں نہ دیں تو وہ گھر کے باہر باتھ روم پیپر یا دوسری گندگی بھی پھینک دیتے ہیں۔ لہذا ہم ہمیشہ بوریاں بھر کر ٹافیاں رکھتے تھے تاکہ کوئی خالی ہاتھ نہ جائے۔

السو برانتے: دائیں طرف کی تصویر میں ہمارے گھر کے باہر ہالووین کا یہ دس کلوگرام کا کدو جس کے اندر روشنی ہو رہی ہے ...... بائیں طرف ہماری نئی نسل: جعفر اور علینہ۔ علینہ نے ایک نے شلوار قمیض کو ہی ہالووین ڈریس قرار دیا۔

اسی طرح مشاعروں اور ادبی محفلوں سے لے کر سالگرہوں، ہالووین اور ایسٹر ایگ ہنٹ دیکھتے ہوئے ایک اور سال گزرا تو ہم نے پاکستان جانے کا منصوبہ بنایا۔ پاکستان کا ویزا لاس انجلس میں پاکستانی سفارتخانے سے ملا۔ اس پر صاف لکھا تھا ''پاکستانی اوریجن''، یعنی کہ پاکستانی نژاد۔ ۲۸ ستمبر ۱۹۹۸ء کو ہم پھر پاکستان روانہ ہوئے۔ اس مرتبہ ہمارے بیٹوں نے ہمیں سنگاپور ائیر لائنز پر بزنس کلاس کا ٹکٹ خرید کر دیا تھا تاکہ ہم زیادہ آرام سے سفر کر سکیں۔ خاطر تواضع ائیر پورٹ سے ہی شروع ہوگئی کہ ہمیں پرواز کے انتظار کے

لئے ایک خاص لاؤنج میں گئے جہاں ہر طرح کے کھانے تھے، اور کچھ لوگوں کے لئے تو پینے پلانے کا بھی انتظام تھا جس سے یہ طیارے سے پہلے ہی عالمِ پرواز میں پہنچ رہے تھے۔

سنگاپور ائیر پورٹ: سنگاپور ائیر لائنز کا بوئنگ ۷۴۷

پرواز کا اعلان ہوا تو ہم جلدی جلدی گیٹ پر پہنچے۔ ہمیں دوسروں سے پہلے اندر جانے کا موقعہ ملا کہ اب ہم اِس عمر پر پہنچ چکے تھے جس میں کچھ فوائدِ ہوتے ہیں اور اُن میں سے ایک یہ بھی تھا۔ جیسے ہی ہم نشست پر بیٹھے، فضائی میزبان نے کھانے پینے سے ہمارے تواضع شروع کی اور پھر سارے راستہ نہایت خاطر تواضع ہوئی۔ طرح طرح کے کھانے ملتے اور ہر دومنٹ کے بعد فضائی میزبان جان نثار کرنے کو تیار ہو کر آتیں۔ ہم کم خوراک انسان ہیں، بس ان سے چائے منگوا کر پیتے رہے۔ چائے بھی آتی تو ایسے سلیقے سے، اور ساتھ میں کئی طرح کی کوکیز کے ساتھ۔ نشست کے ساتھ ایک ۷/انچ کا ٹیلی وژن لگا تھا جس میں چھ یا سات فلمیں مستقل چل رہی تھیں۔ ان میں کارٹون سے لے کر ہالی ووڈ کی جدید فلمیں اور ٹیلی وژن تک کے چینیل تھے۔ ہم ان چیزوں سے محظوظ ہوتے ہوئے سنگاپور پہنچے۔ یہاں چند گھنٹے رکنا تھا۔ اس کے بعد پھر کراچی روانہ ہوئے۔ اب بھی بزنس کلاس میں میزبان دِل لگا کر خدمت کر رہے تھے اور ہم اِس خدمت سے لطف اندوز ہوتے ہوئے ۳۰/تاریخ کو کراچی پہنچ گئے۔ امریکی پاسپورٹ ہونے کی وجہ سے غیر ملکیوں کی قطار میں کھڑے ہوئے، لیکن کاؤنٹر پر پہنچنے سے پہلے ہی ایک خاتون افسر نے ہمیں قطار سے باہر بلا کر ہمارا کام جلدی کروا دیا۔ کچھ ہماری عمر کا خیال تھا، کچھ وہیل چیئر کا، اور کچھ ''پاکستانی نژاد'' ہونے کا۔ اس دن ہم نے پھر دیکھا کہ پاسپورٹ پر مہر بہت نفیس لگی تھی۔ پاکستان کی مہریں اب گھسی پٹی نہیں رہی تھیں۔

اس مرتبہ لمبا رکنے کا ارادہ تھا کہ دو کتابیں چھپوانا تھیں۔ اسی کام میں کافی مصروفیت رہی۔ کچھ مشاعرے بھی ہوئے۔ یعنی کہ کافی اچھا خاصا وقت کراچی میں گزر رہا تھا۔ ہم اپنی دو کتابیں مکمل کر چکے تھے۔

تیسری کتاب ''سفر کب تک'' پر بھی بہت کام ہو چکا تھا۔ چونکہ کراچی میں ایک دن کا کام بھی ایک ہفتے میں ہوتا ہے۔ باقی دن ہڑتالوں کی چھٹیوں اور کاہلی بے دلی میں گزر جاتے ہیں۔ ''سفر کب تک'' کا پہلا مسودہ تیار تھا اور کمپیوٹر پر اس کی لکھائی مکمل ہو چکی تھی۔ اس سے ہم مطمئن نہ تھے۔ ہم نے کچھ قابل حضرات کو اس پر تبصرہ کے لئے مسودہ بھیجا تھا اور ان سے ہمّت افزائی بھی ہو چکی تھی، لیکن ابھی دِل نہیں ٹُھک رہا تھا کہ یہ کتاب چھپواتے۔

جب ہم ۱۹۹۵ء میں کراچی واپس آئے تھے تو گھروں اور مسجدوں میں بارشوں کے لئے دعائیں مانگی جا رہی تھیں۔ کراچی کے شہری بارشوں کے لئے کم ہی دعا مانگتے ہیں کہ یہ رحمتِ الٰہی کراچی کے مکینوں کے لئے باعث زحمت بن جاتی ہے۔ جتنا پانی اوپر سے برسے، کراچی کے کونے کونے میں محفوظ ہو جاتا ہے۔ اس سال بھی یہی حالات تھے۔ ٹینکر سے پیلا یا کھارا پانی آتا تھا۔ کوئی پتہ نہیں کتنا کنوؤں کا اور کتنا سمندری پانی ہوتا تھا۔ ہم نے گھروں میں فلٹر لگائے ہوئے تھے۔ پانی نتھارو، دوائیں ڈالو، تب بھی بو نہیں جاتی تھی، لہذا بعد میں اِسے اُبالنا بھی ضروری ہوتا تھا۔ اب مئی میں جو بارش ہوئی تو ایسی کہ طوفان کے جھکڑ چلیں۔ آدھے گھنٹے میں درخت زمین بوس ہو گئے اور بجلی کے تار جگہ جگہ گر گئے۔ ہمارے گھر کچھ مہمان آنے والے تھے۔ جب وہ دو گھنٹے دیر سے گھر پہنچے تو پندرہ منٹ تو خود کو باہر کے برآمدے میں نچوڑتے رہے۔ یہ بارشوں کا سلسلہ جون تک چلا اور ۲۷/جون کو ایک اور طوفانی بارش نے محرم کی مجالس کے ٹینٹ بھی گرا دیئے۔ غرض کچھ نہیں بدلا تھا، وہی ہم تھے، وہی کراچی، اور وہی پاکستان۔ لیکن جہاں وہی کراچی تھا تو وہی ہم، اور وہی ہمارے ادبی مشاغل۔ لوگ ہر حال میں اپنی زندگی میں مصروفیات اور مشغولیات پیدا کر لیتے ہیں۔ انہی سلسلوں میں سب سے پہلے ہمیں برادر نقّاش کاظمی نے کراچی آرٹس کونسل میں مدعو کیا، اس فرمائش کے ساتھ کہ ہم اپنے ساتھ اپنی کتاب ''معراجِ وفا'' ضرور لائیں۔ یہ اُن دنوں ہر ماہ ایسی محفل منعقد کرتے تھے جس کی وجہ سے اکثر باہر سے آئے ہوئے نئے اور پرانے شعرا سے تعارف اور ملاقات ہو جاتی تھی۔ نقّاش کاظمی نے اس پروگرام کا نام ''نقد و نظر'' رکھا تھا۔ اکتوبر ۱۹۹۸ء شروع ہو چکا تھا اور ہم اس ماہ کے آخری ہفتہ کی شام کو اس میں شرکت کے لئے پہنچے۔ کاظمی صاحب نے ہمارا اور ہماری کتاب کا تعارف کرایا، اِس ذکر کے ساتھ کہ ہماری ان سے ملاقات برکلے یونیورسٹی میں ۱۹۹۳ء میں ہوئی تھی، اور انہوں نے اس کتاب کا مقدمہ لکھا تھا۔ یہاں کے مشاعروں کی بات ہی اور تھی جو امریکہ میں نہیں مل سکتی تھی۔ یہاں ہماری ملاقات راغب مرادآبادی، شبنم رومانی، اوجِ کمال اور سحر انصاری جیسے شاعروں سے ہوئی۔

دوسری طرف محمد شفیع دہلوی کی بیٹی بیگم نادرہ آفتاب ہر ماہ کے آخری ہفتے کے دن ایک مشاعرہ کرتی تھیں جو کہ انجمنِ اردو کراچی کے تحت ہوتا تھا۔ یہاں زیادہ تر سامعین خود شاعر ہی ہوتے تھے اور یا ان کے ساتھ کے ڈرائیور یا ہم جیسے شاعروں کے بیٹے یا بیٹیاں۔ یہیں ہماری ملاقات اطہر شاہ خاں سے ہوئی کہ جو ٹیلی وژن کے ڈراموں میں ''مسٹر جیدی'' کے حوالے سے مشہور ہیں۔ سید ضمیر جعفری اور ترغیب بلند امروہوی سے بھی یہاں ہی ملاقات ہوئی۔ ترغیب بلند ان دنوں اوسلو سے یہاں آئے ہوئے تھے۔

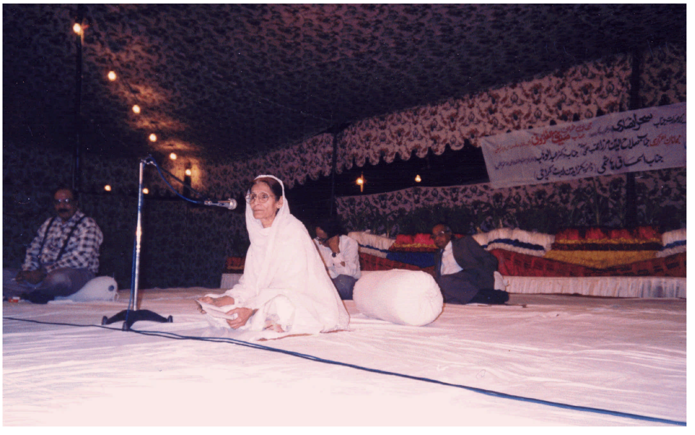

کراچی: ادبی سوسائٹی کے مشاعرے میں سلطانہ آدا کلام گو ہیں۔

ایسے ہی یہاں پر ''رائٹرز فورم'' کی جانب سے مشاعرہ ہوا جس کی نظامت ضیاء الحق قاسمی نے کی تھی اور یہاں سید ضمیر جعفری کی ساٹھ سالہ ادبی خدمات کو خراج پیش کیا گیا تھا۔ اس قدر ادبی ماحول اس وقت زیادہ اچھا لگتا ہے کہ جب آپ اپنی زندگی کی بڑی ذمہ داریوں سے نمٹ چکے ہوں، اور ہم اب اس مقام پر ہیں۔ سوانہی ادبی سلسلوں میں اسی طرح وقت گزرتا رہا اور ۱۹۹۹ء شروع ہو گیا۔

۱۵ رفروری کو ضیاالحق قاسمی صاحب کی جانب سے ایک اور مشاعرہ ہوا تو یہاں ہماری ملاقات طاہر آغا سے ہوئی جو جدّہ سے آئے ہوئے تھے۔ یہ رشتہ میں ہمارے بھانجے بھی ہوتے تھے۔ اس جگہ ہم احمد نوید اور ذکیہ غزل سے بھی ملے۔ قاسمی صاحب ہی نے کراچی ایرو کلب کی جانب سے ایک مشاعرہ کروایا جس کا انتظام وطعام نہایت اعلیٰ تھا، لیکن افسوس صد افسوس کہ پورا میدان جو بہت خوبصورتی سے سجا ہوا تھا، خالی ہی رہا، کہ گنے چنے سامعین پہنچے تھے۔ سارا بہترین کھانا غریبوں میں تقسیم ہوا یا ضائع کرنا پڑا، جب کہ مشاعرہ اور

کھانا میزبان کی طرف سے تھا۔ صاف لگتا تھا کہ زمانہ بدل رہا ہے، اور بہت تیزی سے، کیونکہ انہی دنوں کراچی کے ایک مشہور گلوکار کی محفل کا پانچ سو روپے کا ٹکٹ خریدنے کے لئے لوگ ایک دوسرے پر چاقو سے حملہ کر رہے تھے۔

۲۳/ مارچ کو امروہہ مرکز میں ایک عالمی مشاعرہ ہوا۔ معلوم ہوا کہ امروہہ کی پرانی روایت کے مطابق خواتین اس مشاعرے میں اپنا کلام نہیں پڑھ سکیں گی، افسوس ہوا۔ ہم سامعین میں اپنا دل تھامے بیٹھے رہے۔ مشاعرے کی نظامت شاہدہ حسن اور نقّاش کاظمی نے انجام دی تھی۔ اس مشاعرہ میں کیفی اعظمی آئے، وہیل چیئر پر۔ احمد فراز اُن کے ساتھ تھے اور یہ صاحب کیفی اعظمی کو انہی کے اشعار یاد دلاتے تو کیفی صاحب وہ اشعار پڑھتے۔ پھر احمد فراز صاحب خود بھی اشعار بھولنے لگے تو شاہدہ حسن نے جلدی سے دوسرے شعرا کو مدعو کیا۔ صبح ۴/ بجے یہ مشاعرہ ختم ہوا۔ اسی شام کو بخاری اوپن تھیٹر آرٹس کونسل میں بیادِ جوشؔ اور فیضؔ ایک مشاعرہ ہوا اور ہم بھی مدعو تھے۔ اِس مشاعرے میں جب کوئی سیاسی شاعری کرنے لگتا تو پچھلی نشستوں سے شاعروں پر ہوٹنگ ہوتی۔ لیکن اِس کے باوجود بھی سامعین نے مشاعرے کو بہت پسند کیا اور یہ شام بہت اچھی رہی۔ ہم سوچتے ہیں کہ ہوٹنگ ہمیشہ پچھلی نشستوں سے کیوں ہوتی ہے۔ شاید وہ حضرات زیادہ قابل ہیں، یا کم قوّتِ برداشت والے ہیں، یا غصّہ میں ہیں کہ وہ پچھلی نشستوں پر کیوں ہیں، اور یا یہ کہ اگلی نشستوں والے نظروں میں آجانے کے ڈر سے خاموش رہتے ہیں ورنہ وہ بھی ہوٹنگ کرتے ہوئے پائے جاتے۔ غرض اُس کے بعد ائیرویز ایمپلائیز یونین کی جانب سے نیپا آڈیٹوریم میں جوشؔ صدی کا مشاعرہ ہوا، جو دو دن چلا اور بہت کامیاب رہا۔

غرض مارچ اور اپریل کے مہینے اسی طرح گزرے۔ ہماری کتابیں چھپ چکی تھیں اور ہم ادبی ماحول میں ایسے محو رہے کہ ہمیں خبر بھی نہ ہوئی اور پاکستان میں پھر کچھ ہنگامہ شروع ہوگیا۔ ۱۲/ اکتوبر ۱۹۹۹ء کی شام، ایک صاحب جو اپنا نام جنرل پرویز مشّرف بتا رہے تھے، ٹیلی وژن پر آکر کہنے لگے کہ پاکستان کی باگ ڈور اب اُن کے ہاتھ میں ہے۔ نواز شریف جیل میں ہیں، جنرل صاحب کے طیارے کے اغوا کے سلسلے میں۔ ہم نے بھی سوچا کہ یہ الزام تو کچھ غلط لگتا ہے، نواز صاحب تو بہت دیانتدار شخص تھے۔ انہوں نے اسی سال پورے ۸۰۰/ روپیہ ٹیکس دیا تھا۔ غرض پاکستان کی صورتِ حال پھر ناگفتہ بہ ہوگئی، گو کہ جنرل صاحب کے آنے

پر گلی کوچوں میں مٹھائیاں تقسیم کی گئی تھیں، کہ یہ شیرِ کارگل تھے۔ ہم نے یہاں سے چلنے کا فیصلہ کرلیا۔

دوسرے دن ۱۳/ اکتوبر، بروز بدھ، تمام بینک بند تھے، فوج کے حکم سے۔ اِس مرتبہ پاِکستان میں کافی رہ لئے تھے لیکن اِیسا محسوس ہوتا رہا کہ کل ہی کی بات ہو کہ ہم یہاں آئے ہوں۔ اِدھر اَمریکہ اور کینیڈا میں جو بچّے تھے، ان کا تقاضہ یہ کہ بس آپ آجائیں بہت رہ لیں۔ سو ۱۶/ اکتوبر ۱۹۹۹ء کو سنگا پورا یرلائنز سے رات کے ۹/ بجے روانگی تھی۔ ہمارے بیٹے بہوٹرمینل سے باہر ہی ہمیں خدا حافظ کہہ کر واپس چلے گئے۔ ہم اندر کسٹمز سے گزر کر سامان سنگا پورا ئیرلائنز کی وزن کرنے کی مشین پر جمع کرنے لگے تو معلوم ہوا کہ سامان زیادہ تھا۔ یہاں کے ایک افسر نے ۱۸۰۰۰/ روپے طلب کئے، سامان کی زیادتی کے۔ ہم نے اُن سے کہا کہ ''ہم ہمیشہ دو سوٹ کیس ہی لیکر آتے جاتے رہیں ہیں کبھی بھی ایسا اعتراض نہیں ہوا۔ دوسرے یہ کہ آپ پہلے بتاتے۔ اب تو ہمارے گھر کے لوگ بھی واپس چلے گئے''۔ انہوں نے مہربانی کرنے کی کوشش کی اور سامان کی فیس ۷۵۰۰/ روپے کردی۔ یہ سُن کر ہم نے اپنے پرس سے سوڈالر کا نوٹ اپنی مُٹّھی میں پکڑا اور بقایا ۴۰۰/ ڈالر، سوسوڈالر کے چار نوٹ، اپنے بیگ میں ڈال کر، بیگ اپنے کندھے پر ڈال لیا۔ ہم اپنی وہیل چیئر سے اتر کر کھڑے ہوگئے تھے۔ وہ صاحب فون میں مصروف تھے اور سب لوگ ہمارے پیچھے کھڑے ہوئے منہ بنارہے تھے۔ اب دیر ہونے لگی تھی۔ ان صاحب نے فون بند کر کے اپنے ساتھی سے کہا کہ ''اِنہیں اُوکے کرو''۔ اِن کے ایک لفظ اوکے کہنے کہ ساتھ ہی پورا کا پورا سامان بیلٹ پر سرکا، ہماری جان میں جان آئی۔ ہم دوبارہ وَہیل چیئر پر بیٹھے اور لاوَنج میں آکر وہیل چیئر بان (جیسے کہ گاڑی بان) سے کہا کہ ''جلدی سے ایک گلاس پانی لے آوَ، فلائٹ جانے ہی والی ہے''۔ یہ چیئر بان صاحب تیزی سے پانی لینے چلے۔ اتنے میں اعلان ہوا کہ ۹/ بجے کی یہ پرواز اب ۱۱/ بجے چلے گی۔ چیئر بان صاحب کی رفتار بھی اسی مناسبت سے کم ہوگئی۔

پرواز کے دوران تمام راستے وہی بزنس کلاس کی خاطر تواضع۔ پانی اور کوک، کوکیز ہر چند منٹ کے بعد۔ جب کھانا شروع ہوا تو میزبان صاحبہ نے ہمارے لئے ایک خاص کھانا لاکر دیا اور کہا، ''یور مسلم فوڈ (your Muslim food)''۔ ہم نے آس پاس دیکھا تو سب لوگ ایک ہی جیسا کھانا کھا رہے تھے۔ یہ سب ایسے تھے کہ انہیں اردو یا ہندی نہیں آتی تھی۔ ہم نے اپنے بچوں کے اصرار پر بزنس کلاس میں سفر کیا تھا لیکن ہمیں مزہ اکانومی ہی میں آتا تھا کیونکہ اس میں آس پاس اردو بولنے والے مل جاتے تھے اور کم ازکم

ایک فضائی میزبان اردو بولنے والی ہوتی تھی۔ یہاں بزنس کلاس میں ایسا کچھ نہیں تھا۔غرض ہم نے اپنا کھانا دیکھا تو وہ کچھ ہندوانی لگا۔ ہم نے میزبان کو بلایا اور اسے دکھایا۔اس نے ٹرے میں پڑی ہوئی ایک پرچی دیکھی تو معافی مانگ کر کھانا واپس لے گئی اور دوسری ٹرے لے آئی جو صرف چاول اور سبزی پر مشتمل تھی۔ہم نے اس کو بھی چھوڑا اور اپنے بیگ سے اپنے کباب اور پراٹھا نکال کر کھانے لگے تو ائیر ہوسٹس کو احساس ہوا۔ اس نے یہ کباب پراٹھا ہم سے لے کر گرم کیا اور اسے ایک ٹرے میں نفاست سے سجا کر لے آئی۔ یہ میزبان صاحبہ ہمارے قریب بیٹھ کر ہم سے پوچھنے کی کوشش کرتی رہیں کہ ہمیں اور کچھ چاہیئے ہو تو ہم اس سے فوراً طلب کر سکیں۔ ناشتہ میں بھی یہی ہوا۔ہم نے صرف گرم چائے پی، چار یا پانچ چینی کے چھوٹے بیگ اس میں ڈال کر۔ دوسرے تمام مسافر کھانے کے ساتھ ساتھ تمام وقت مئے نوشی فرماتے رہے۔ جب پائلٹ نے اعلان کیا کہ جہاز ۳۷۰۰۰ ہزار فٹ کی بلندی پر ہے تو کچھ مسافرین واضح طور پر اُس وقت خلائی فلائٹ میں تھے۔

اِس سفر میں ایک غلطی ہم سے یہ ہوئی کہ ہم نے اپنا بیگ ایک کمبل کے نیچے رکھ دیا اور سارے راستے بار بار اٹھ کر جاتے رہے کہ اتنی چائے اور پانی پی کر بیٹھے تھے۔اس مرتبہ ہمیں کھڑکی کے ساتھ کی نشست ملی تھی جس کی وجہ سے ہمارے برابر والے صاحب کو بار بار تکلیف ہوتی رہی۔غرض اسی طرح سان فرانسسکو پہنچے۔اب ۱۸/اکتوبر کا دن شروع ہو چکا تھا۔ یہاں پرس کھولا تو دیکھا کہ جس لفافے میں ہم نے چار سو ڈالر رکھے تھے وہ غائب تھا۔ساتھ ہی زیور بھی رکھا تھا لیکن وہ کسی نے چھوا بھی نہیں تھا۔ یہی خیال ہوا کہ جب ہم چائے رفع کرنے گئے ہوں گے،تو اس وقت ہمارے برابر کے صاحب نے ہاتھ صاف کیا ہوگا۔سفر میں یہ غلطی ہم نے پہلی مرتبہ کی تھی کہ پرس نشست پر چھوڑ گئے۔گمان بھی نہیں تھا کہ جہاز کے اندر بزنس کلاس میں بھی اِیسا ہوگا۔ ہمارے صاحبزادے اعجاز کہنے لگے،''آپ نے کراچی ائیر پورٹ پر ہی گرا دیئے ہونگے، ورنہ بزنس کلاس میں ایسا ہونا نہیں چاہیئے''۔لیکن ہمیں اچھی طرح یاد تھا کہ ہم نے یہ لفافہ اور ڈالر جہاز کے اندر بھی دیکھے تھے۔ یہ چار سو ڈالر ہمیں رہ رہ کر بہت عرصے تک یاد آتے رہے،اور اسی ناطے سے یہ بزنس کلاس کا سفر ہمیں ہمیشہ یاد رہے گا۔